کیا متفقہ اسلامی احکام کو اجتہاد کے ذریعہ بدلا جا سکتا ہے؟

(از مولوی حافظ حبیب اللہ صاحب ندوی)

(۶)

کتابیہ کے ساتھ نکاح کے حکم کی منسوخی معلوم نہیں مولانا جعفر صاحب ندوی نے یہ بات کہاں سے پیدا کر لی کہ قرآن کی اجازت کے بغیر حضرت عمرؓ نے کتابیہ کے ساتھ نکاح کو منسوخ قرار دے دیا، اور مسلمانوں کو اس سے روک دیا، اولیاتِ عمرؓ میں مولانا نے جو یہ اضافہ فرمایا ہے، اس کا ثبوت کم از کم راقم کو تو کسی قابلِ ذکر تذکرہ و تاریخ کی کتاب میں نہیں ملا، اسی طرح آپ نے حضرت علیؓ کے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ انھوں نے بھی ایسا ہی کیا، [1]

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے بعض شرعی وجوہ کی بنا پر اس سلسلہ میں کچھ پابندیاں ضرور عائد کیں مگر وہ حکم علی حالہ باقی رہا، اس میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، مختصراً اس کی تفصیل ملاحظہ ہو،

سورۂ مائدہ کی ابتدا میں حرام و حلال اشیاء کا تذکرہ کرتے ہوئے اہل کتاب عورتوں کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ (مائدہ-۱)	(مومن عورتوں کے علاوہ) تم اہل کتاب کی پاک باز عورتوں سے بھی نکاح کر سکتے ہو۔ (مگر شرط یہ ہے) کہ جب تم ان کا مہر ادا کر دو، اس طرح پر کہ تم ان کو بیوی بنا کر رکھو، نہ ان سے اعلانیہ بدکاری کرو اور نہ چھپ چھپا کر،

اس آیت سے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ پاک باز کتابیہ عورتوں سے کتابیہ رہتے

[1] ثقافت اپریل ۱۹۵۷ء

ہوئے بھی وہ نکاح کر سکتے ہیں لیکن یہ اجازت کئی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک یہ کہ واقعی کسی ایسی آسمانی کتاب پر جس کا آسمانی کتاب ہونا ثابت ہو، ایمان رکھتی ہوں، دوسرے یہ کہ یہ نکاح پاک باز عورتوں سے کیا جائے، تیسرے یہ کہ یہ نکاح واقعی نکاح ہو، علانیہ یا خفیہ طور پر زنا و بدکاری کا بہانہ یا پیش خیمہ نہ ہو۔

اہل کتاب کا لفظ قرآن میں عام طور پر یہود و نصاریٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، لیکن چونکہ قرآن نے لفظ عام اُوتُوا الْکِتَاب استعمال کیا ہے، اس سے بعض صحابہ، تابعین اور تبع تابعین نے ان صابئین کو بھی اس عموم میں داخل کیا ہے جو یا تو نیم عیسائی تھے یا حضرت یحییٰ کے پیرو تھے، اور خود یہودیوں اور عیسائیوں میں کچھ تو قدیم عیسائی تھے، اور کچھ سیاسی و معاشرتی دباؤ کی بنا پر اپنے کو یہودی یا عیسائی کہنے لگے تھے۔ اس لئے اس کی تعیین میں صحابہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہوا، وہ اختلاف صرف یہ تھا کہ کون کون لوگ اس عموم میں داخل ہیں، اور کون اس سے خارج ہیں، کیا وہ لوگ جو نسلاً تو عرب ہیں، مگر انہوں نے معاشی یا سیاسی دباؤ کی بنا پر عیسائیت یا یہودیت قبول کر لی ہے، وہ بھی اس عموم میں داخل کئے جا سکتے ہیں؟ مثلاً قبیلہ بنو تغلب جو نسلاً تھا تو عربی قبیلہ مگر عراق کی سرحد پر آباد ہونے اور سیاسی و معاشی طور پر رومیوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی، اسی بنا پر حضرت علیؓ اس قبیلہ کے عیسائیوں کو اہل کتاب میں شامل نہیں کرتے، وہ فرماتے تھے کہ ان میں شراب نوشی اور سود خواری کے علاوہ کوئی خصوصیت ایسی نہیں ہے جو ان میں اور عیسائیت میں پائی جاتی ہو، اس لئے وہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنے سے منع فرماتے تھے، مگر ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ گو ان میں قدیم عیسائیوں کی خصوصیات نہیں ہیں، مگر کم از کم ان ہی میں ملے ملے اور ان کے حلیف ہیں، اس بنا پر یہ بھی ان ہی میں شمار ہوں گے، کیونکہ قرآن میں ہے کہ جو ان کے دوست ہیں وہ ان ہی میں ہیں، اس لئے ان کی عورتوں سے بھی شادی کی جا سکتی ہے، اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عراق کے صابئیوں کو اہل کتاب میں شمار کرتے تھے جنہوں نے ظاہری طور پر عیسائیت[1] قبول

[1] قرآن صابئین کے نام سے جن لوگوں کو یاد کرتا ہے۔ وہ اصل میں کواکب پرست ہیں، لیکن جو صابئی کہ عراق اور اور جزیرہ کے قریب آباد تھے، انہوں نے قسطنطین کے غلبہ کے بعد مجبوراً عیسائیت قبول کر لی تھی، ظہور اسلام کے وقت کواکب پرست صابئی زیادہ تر حران کے آس پاس آباد تھے، تو جو لوگ ان ستارہ پرست صابئیوں کے سامنے رکھتے ہیں، وہ اس کو مشرک قرار دیتے تھے، اور جو ان کو عیسائی سمجھتے ہیں، وہ ان کو اہل کتاب (باقی ص ۱۸۰ پر)

کر لی تھی،

اس تفصیل سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ صحابہ اور تابعین میں ان کی تعیین کے بارے میں اختلاف تھا، اور اختلاف کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو قرآن میں مشرک عورتوں سے نکاح حرام اور ممنوع قرار دیا گیا ہے ولا تنکحوا المشرکات حتی یومن، اور دوسری طرف اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا گیا، حالانکہ ان میں بھی عیسائیوں کے کتنے گروہ ایسے تھے، جو اپنے عقیدہ و عمل میں اہل کتاب کے مقابلہ میں اہل شرک سے زیادہ قریب تھے، اس لئے ان کو کس میں شمار کیا جائے، چنانچہ حضرت علی رضؓ نے اسی بنا پر بنو تغلب کی عورتوں سے نکاح کرنے سے منع فرمایا کہ ان پر عیسائیت کے بجائے شرک و بت پرستی غالب تھی، اور شریعت کا یہ اصول ہے کہ جب تحلیل و تحریم دونوں جمع ہو جائیں تو تحریم ہی کو ترجیح دی جائے گی،

حضرت علی رضؓ کی اس اجتہادی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے اہل کتاب سمجھتے ہوئے بھی کتابیہ عورتوں سے نکاح ممنوع قرار دے دیا، مگر حضرت عمر رضؓ کے بارے میں تو یہ بات بھی نہیں ملتی کہ انہوں نے کسی خاص گروہ کو اس گروہ سے خارج کیا ہو، ان کے بارے میں یا تو یہ واقعہ ملتا ہے کہ انہوں نے بنو تغلب کے عیسائیوں کو یہ حکم دیا تھا کہ جو عیسائی مسلمان ہو جائیں، اور وہ یتیم بچے اور بچیاں چھوڑ کر مر جائیں تو ان کو عیسائی نہ بنائیں، بلکہ ان کو مسلمان ہی رہنے دیں، کیونکہ جب ان کے باپ مسلمان تھے تو ان کے بچوں کو مسلمان ہی سمجھا جائے گا، یہ حکم ان کو اس لئے دینا پڑا کہ بنو تغلب کے عیسائی ان کو بھی عیسائی بنانے کی کوشش کرتے تھے، یا پھر ان کے بارے میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت حذیفہ نے مدائن میں ایک کتابیہ سے شادی کر لی تھی، تو آپ نے ان کو حکم دیا کہ وہ طلاق دیدیں مگر اس کا تو کہیں ذکر بھی نہیں ملتا کہ انہوں نے اس بارے میں عام اہل کتاب کے بارے میں یا کسی مخصوص عیسائی یا یہودی کے گروہ کے بارے میں یہ حکم دیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے یا ان سے کرنا ممنوع ہے،

حضرت حذیفہ کو انھوں نے اس سے کیوں منع کیا، اس کی تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ ہو،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹) میں شامل کرتے تھے، چونکہ امام صاحب عراق کے رہنے والے اور اس کے آس پاس یہی آباد تھے اس لئے انہوں نے انھیں اہل کتاب کہا،

حضرت حذیفہؓ مدائن[1] کے امیر تھے، انہوں نے وہاں ایک یہودیہ سے شادی کر لی جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان کو لکھا کہ خل سبیلھا اس کو طلاق دے دو، حضرت حذیفہ نے لکھا کہ آحرام ھی، کیا اس سے نکاح کرنا حرام ہے؟ حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ

لا ولکنی اخاف ان تو قعوا المومسات[2] ان سے نکاح کرنا حرام تو نہیں مگر میں ڈرتا ہوں کہ تم اس طرح ان کی فاحشہ اور بدچلن عورتوں پر بھی نہ جا پڑو۔ منھن۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو حرام و ممنوع قرار نہیں دیا تھا، بلکہ ان کو اس سے باز رکھنے کا اصل سبب یہ تھا کہ یہ چیز زناکاری اور بدچلنی کا پیش خیمہ بن جائے، حضرت عمرؓ کے اس حکم کو سمجھنے کے لئے اس وقت کے عراق و مدائن کی اخلاقی حالت سے واقفیت کی بھی ضرورت ہے، اس علاقہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کی اکثریت تھی اور دونوں فرقوں کی اخلاقی حالت انتہائی زبوں تھی، خاص طور پر یہودی عورتیں تو اپنی بدچلنی میں ہر جگہ مشہور تھیں، حضرت حذیفہ ایک ممتاز صحابی اور وہاں کے امیر تھے، اس لئے آپ نے ان کو اس سے روکا کہ کہیں ایسا نہ ہو، کہ ان کا یہ طرز عمل وہاں کے عام مسلمانوں کے لئے جن میں اکثریت نو مسلموں کی تھی کسی برائی کا پیش خیمہ بن جائے، گو حضرت حذیفہؓ جائز طریقہ پر اس کو اپنے حبالۂ عقد میں لائے تھے، مگر حضرت عمرؓ کی دور بین نگاہیں اس پہلو پر تھیں کہ عام لوگوں کی نظر طریقۂ عمل کی صحت و عدم صحت پر کم ہوتی ہے، وہ صرف طریقۂ عمل کے نتیجہ کو دیکھتے ہیں اور اسی کو اپنے لئے مثال بناتے ہیں، اس لئے وہ جب ان کی طرف متوجہ ہوں گے، جس کے امکانات بہت تھے، تو پھر نیک و بد کی تمیز کے بغیر وہ ان سے تعلقات قائم کریں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی معاشرہ جس کی نشو و نما وہاں ابھی ابھی شروع ہوئی ہے، وہ بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا، اور وہ لوگ جو ابھی ابھی سیاسی حیثیت سے مغلوب ہوئے تھے، اس طرح ان کے دوبارہ غالب آجانے کے امکانات بھی پیدا ہو جائیں گے،

ان مصالح کو سامنے رکھ کر حضرت عمرؓ کے اس حکم پر غور کیا جائے تو وہ بالکل قرآن کے منشاء کے

---

[1] مدائن دجلہ و فرات کے دوآبہ کے درمیان کا ایک حصہ تھا، عراق کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی یہودی و نصرانی کثرت سے آباد تھے، بغداد کی تعمیر سے پہلے اس کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بعد میں بغداد کو ہوئی۔

[2] احکام القرآن جصاص ج ۲، ص ۳۲۴۔

مطابق معلوم ہوتا ہے۔

قرآن نے کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتے ہوئے احصان، پاک دامنی، غیر مسافحین، کھلی ہوئی بدچلنی چھپی ہوئی بدچلنی و لامتخذین اخدان کی قیدیں لگائی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اس بات کا امکان ہوگا کہ ان قیدوں کی پابندی نہیں ہو سکے گی، وہاں اس کی اجازت نہیں دی جائے گی، تو حضرت عمرؓ کا یہ لکھنا کہ "تم بدچلن عورتوں پر نہ جا پڑو" کیا بالکل منشائے قرآنی کے مطابق نہیں تھا؟

غرض یہ کہ بہت سے دینی و سیاسی مصالح کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے یہ مخصوص حکم دیا تھا۔ جس کا بحیثیت امیر ان کا حق تھا، اس کا تعلق کتابیہ کے نکاح کی منسوخی سے قطعی نہیں تھا، اگر واقعی انہوں نے یہ حکم نافذ ہی کر دیا ہوتا تو نہ تو حضرت حذیفہؓ سوال و جواب کی جرأت کر سکتے تھے، اور حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ وغیرہ اہل کتاب عورتوں کو اپنے حبالۂ عقد میں رکھ سکتے تھے، مگر ان دونوں بزرگوں نے آخر وقت تک ان کو اپنے نکاح میں رکھا، اور حضرت عمرؓ نے کبھی کوئی تعارض نہیں کیا۔ خود حضرت حذیفہؓ کے بارے میں یہ مذکور نہیں ہے۔ کہ انہوں نے طلاق دے بھی دیا۔ اس لئے کہ دوسرے خط میں حضرت عمرؓ نے صرف یہ لکھا ہے۔ کہ یہ حرام تو نہیں ہے، مگر یہ تحلیل کسی حرام کے ارتکاب کا سبب نہ بن جائے،

غور فرمائیے، واقعات کی کیا صورت تھی اور ان حضرات نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے ان کو کیا صورت دے دی، کاش! یہ حضرات خلفائے راشدین کے فیصلوں کو کتاب و سنت کے خلاف ثابت کرنے سے پہلے ان کے مالہ و ماعلیہ پر غور کر لیتے، اور خود کتاب و سنت کے منشاء کو سمجھ لیتے تو اس کی باتیں لکھنے میں ان کا قلم اتنا بے باک نہ ہو جاتا،

تجارتی گھوڑوں کی زکوٰۃ اس مسئلہ کے سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں اونٹ، بکری اور دوسرے حلال جانوروں کے پالنے والوں سے ان کی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔ لیکن گھوڑوں کو پالنے کی کوئی زکوٰۃ نہ لی جاتی تھی۔ بلکہ آپ کے ایک ارشاد سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حکماً اس سے منع فرمایا ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے اس اسوہ اور ارشاد نبوی کے باوجود اپنے اجتہاد سے گھوڑوں پر ایک دینار سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی،

اس مسئلہ کی تفصیل سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جزیرہ عرب میں گھوڑوں کے

پالنے کا رواج بھی تھا، اور یہ بڑی عزت کی چیز بھی سمجھی جاتی تھی، لیکن یہ صرف جنگی ضرورتوں یا سفر کی سہولت کے لئے پالے جاتے تھے۔ اونٹ، بکری اور دوسرے جانوروں کی طرح افزائش نسل، تجارت یا لباس اور غذائی ضرورتوں کے لئے ان کے پالے جانے کا رواج نہیں تھا، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اونٹ یا بکری وغیرہ کے پالنے میں ان کو نگرانی کے علاوہ اور کوئی زحمت اٹھانی نہیں پڑتی تھی۔ نہ تو ان کے چارہ کے لئے کوئی اہتمام کرنا پڑتا تھا، اور نہ رہائش کے لئے مکان فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ بلکہ "وادی غیر ذی زرع" کے کھلے ہوئے میدان ان کے لئے چارہ اور رہائش گاہ دونوں کا کام دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عربوں کی عام آبادی نہ تو ان جانوروں کے پالنے میں کوئی دقت محسوس کرتی تھی اور نہ ان کی خرید و فروخت میں، برخلاف اس کے گھوڑوں کے خریدنے میں ایک بڑی رقم کی بھی ضرورت ہوتی تھی، اور ان کے لئے اچھی غذا اور رہائش کے لئے مکان کی بھی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ جزیرۂ عرب کی عام انسانی آبادی خود ان نعمتوں سے محروم تھی۔ وہ گھوڑوں کے لئے کہاں سے یہ چیزیں فراہم کر سکتی تھی۔ جبکہ ان کے ذریعہ ان کی کوئی بنیادی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے گھوڑوں کے پالنے کا رواج وہاں صرف خوشحال طبقہ ہی میں تھا۔ جو پوری آبادی کا مشکل سے سوواں حصہ تھا۔ گو عربی نسل کے گھوڑے پوری دنیا میں مشہور تھے۔ مگر یہ عربوں کے مقابلہ میں ایرانیوں اور رومیوں کے پاس زیادہ پائے جاتے[1] تھے، کیونکہ وہ عربوں کے مقابلہ میں زیادہ خوش حال بھی تھے اور زرخیز علاقہ ہونے کی وجہ سے ان کی پرورش اور خورد و پرداخت کا سامان بھی ان کو ہر طرف فراوانی سے مل جاتا تھا، چنانچہ مسلمانوں سے ان کی جتنی لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں دوسرے اسلحوں کے ساتھ گھوڑوں کی بھی ریل پیل ہوتی تھی، وہاں گھوڑے صرف جنگی ضرورتوں ہی کے لئے نہیں بلکہ افزائش نسل اور تجارت کی غرض سے بھی پالے جاتے تھے، چنانچہ حضرت فاروقؓ کے زمانہ میں جب یہ علاقے مکمل طور پر فتح ہوئے تو ایک نیا مسئلہ ان کے سامنے آیا، کہ جس طرح اونٹ بکری اور دوسرے سائمہ جانور جب تجارت یا نسل بڑھانے کے لئے پالے جاتے ہیں تو ان کی زکوٰۃ لی جاتی ہے، تو گھوڑے جو ان ہی مقاصد کے تحت ان علاقوں میں پالے جاتے ہیں تو ان کی زکوٰۃ بھی لی جائے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت عمرؓ

---

[1] عربی نسل کے گھوڑوں کے علاوہ بھی بعض اچھی نسل کے گھوڑے ایرانیوں کے پاس ہوتے تھے جنکو وہ برذون کہا کرتے تھے بعض لوگ اس کو ایرانی نژاد کہتے ہیں اور بعض ترکی نژاد بعض حیثیتوں سے ان کو عربی گھوڑوں پر بھی ترجیح دی جاتی تھی۔

نے صحابہ کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا، اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے مالکوں سے زکوٰۃ واجبہ تو نہیں لی جاسکتی، لیکن بطور صدقہ ایک دینار یا دس درہم سالانہ فی راس وصول کیا جائے، یہ فیصلہ ان حضرات نے اس لئے کیا کہ جن وجوہ کی بنا پر دوسرے جانوروں پر زکوٰۃ عائد کی گئی تھی، قریب قریب وہ تمام وجوہ یہاں بھی پائے جاتے تھے، اس لئے ان پر بھی بطور صدقہ ایک رقم لگا دی گئی، لیکن اس کو زکوٰۃ واجبہ اس لئے قرار نہیں دیا گیا کہ عہد نبوی میں اس کی نہ تو کوئی مثال موجود تھی، اور نہ تو صراحۃً آپ نے ان کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم فرمایا تھا۔

غرض یہ کہ عہد نبوی میں گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کا کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا، اس لئے ان کے بارے میں آپ نے صراحۃً کوئی حکم صادر نہیں فرمایا تھا، اور جب یہ سوال پیدا ہوا تو چونکہ آپ کے کسی ارشاد سے صراحۃً اس کی ممانعت ثابت نہیں تھی، بلکہ بعض ارشادات سے اشارۃً یہ پتہ چلتا تھا کہ اس کی گنجائش ہے، اور قیاساً بھی ان پر صدقہ عائد کرنے کی گنجائش نکلتی تھی، اس لئے ایسا کیا گیا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر اس ارشاد نبوی ؐ کا کیا مطلب ہوگا جس میں آپ نے صراحۃً فرمایا ہے۔

لیس علی المسلم فی عبدہ ولا فی فرسہ صدقۃ — نہ تو مسلمان غلام پر صدقہ ہے اور نہ اس کے گھوڑے پر۔

یہ ارشاد نبوی ؐ ان غلاموں اور گھوڑوں سے متعلق ہے جو آدمی اپنی ذاتی سواری یا خدمت کے لئے رکھتا ہے، چنانچہ غلام یعنی خدمت گار کے ساتھ ہی اس کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر آپ کو گھوڑوں کی زکوٰۃ سے صراحۃً روکنا ہوتا تو آپ فی فرسہ (یعنی ہ) کی ضمیر کے بجائے مطلق لفظ ولا فی فرس ارشاد فرماتے۔

پھر یہ ارشاد اس لئے بھی اسی معنی پر محمول کیا جائے گا کہ آپ کے عہد میں جن مسلمانوں کے پاس گھوڑے تھے وہ محض ذاتی استعمال ہی کے لئے تھے، اس کے برخلاف دوسرے ارشادات نبوی سے صراحۃً تو نہیں مگر اشارۃً یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر یہ تجارت یا نسل بڑھانے کی غرض سے رکھے جائیں تو ان کا صدقہ لیا جاسکتا ہے، آپ نے ایک بار فرمایا کہ گھوڑوں کے پالنے کا نتیجہ تین طرح سے ظاہر ہوتا ہے ایک آدمی کے لئے تو ان کا پالنا اجر و ثواب کا سبب بنتا ہے، دوسرے کے لئے وہ عذاب و عتاب کا سبب بنتے ہیں، اور تیسرے کی عزت و آبرو کی پردہ پوشی ان سے ہوتی ہے، یعنی وہ شخص جو کسی دینی مقصد یعنی جہاد وغیرہ

کے لئے نہیں پالتا، صرف اپنی زینت اور عزت افزائی کے لئے پالتا ہے، ایسے شخص کو گھوڑا پالنے کی اجازت تو ہے، لیکن جب وہ

لم ینس حق اللہ فی رقابھا ولا فی ظھورھا[1] خدا کا وہ حق جو ان کی گردنوں اور پیٹھوں سے متعلق ہے، نہ بھولے،

معلوم یہ ہوا کہ جو گھوڑے خدا کے دین کی خدمت ہی کے لئے پالے جائیں، تو ان کا پالنا سراسر اجر و ثواب ہے، اور جو اس کے خلاف مقصد پالے جائیں، وہ سراسر عذاب و عتاب کا سبب ہیں، لیکن جو نہ تو کسی خالص دینی مقصد کے لئے پالے جائیں اور نہ غیر دینی مقصد کے لئے بلکہ صرف مادی زینت و آرائش یا مادی فائدے کے لئے پالے جائیں۔ تو وہ ان کے لئے پردہ پوش اس وقت ہو سکتے ہیں جب ان کی گردن اور پیٹھ کا حق ادا کر دیا جائے۔ پیٹھ کا حق ظاہر ہے کہ اس پر سوار ہو کر جہاد کیا جائے اور گردن کا حق اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے اوپر صدقہ جاری کیا جائے، کوئی مالی یا غیر مادی ذمہ داری ڈالنے کے موقع پر رقبہ یا رقاب کا لفظ عموماً استعمال کیا جاتا ہے،

اوپر اس مسئلہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس سے یہ بات غالباً واضح ہو گئی ہو گی کہ حضرت عمرؓ نے نہ تو عہد نبوی اور عہد صدیقی کے تعامل کے خلاف کوئی فیصلہ کیا اور نہ ارشاد نبوی کے خلاف، بلکہ ان کا فیصلہ بالکل ایک نئی صورت سے متعلق تھا، اگر کوئی یہ بات ثابت کر دے کہ عہد نبوی میں تجارت اور افزائش نسل کے لئے گھوڑے پالے جاتے ہوں اور پھر بھی آپ نے ان کی زکوٰۃ نہ لی ہو یا اس سے صراحۃً منع فرمایا ہو، تو البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عہد نبوی اور عہد صدیقی کے تعامل کے خلاف کوئی فیصلہ کیا، لیکن جب یہ بات ثابت نہیں ہے تو اس کو خلافِ سنت نبوی کہنا کم سوادی اور علمی کم مائگی کے علاوہ اور کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ حضرت عمرؓ کے استدلال کو قیاسی طور پر قابلِ ترجیح قرار نہ دے کر اس کو واجب قرار نہ دیا جائے، لیکن خلاف سنت کہنا انتہائی جرأت کی بات ہے۔

اب مختصراً وہ تفصیل بھی ملاحظہ کر لیجئے جو گھوڑوں پر صدقہ مقرر کرنے سے متعلق حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔

حارثہ بن مضرب بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے ساتھ حج میں شریک تھا، آپ کی

---

[1] معانی الآثار ج ۱ ص ۳۱۱

خدمت میں شام کے کچھ معززین آئے اور عرض کیا کہ اے امیر المومنین ہمارے پاس بہت سے گھوڑے، دوسرے جانور اور غلام وغیرہ ہیں، آپ ان کا صدقہ لے کر ہم کو پاک کر دیجئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیقؓ نے تو گھوڑے اور غلام پر کوئی صدقہ نہیں لیا مگر ذرا ٹھہرو میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ کر لوں، چنانچہ آپ نے ممتاز صحابہ سے مشورہ کیا، تو سب نے صدقہ وصول کرنے کی رائے دی، مگر حضرت علیؓ اب تک خاموش تھے، حضرت فاروقؓ نے ان کی رائے معلوم کی تو انھوں نے بھی عام صحابہ کی رائے کی تائید کی، مگر اس میں یہ شرط لگا دی کہ

ان لم یکن امراً واجباً ولا جزیة راتبة یؤخذون بها	یہ نہ ان پر فرض قرار دیا جائے اور نہ اس کو مقررہ ٹیکس سمجھا جائے کہ لامحالہ ان سے وصول ہی کیا جائے،

چنانچہ اس کے بعد عمدہ گھوڑوں پر دس درہم سالانہ اور ہجین پر آٹھ اور برذون وغیرہ پر پانچ درہم سالانہ زکوٰۃ مقرر کی گئی[1]

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد امام طحاوی لکھتے ہیں:۔

> حضرت عمرؓ نے گھوڑوں پر جو صدقہ عائد کیا تھا۔ وہ زکوٰۃ واجبہ کے علاوہ ایک صدقہ تھا چنانچہ حضرت علیؓ نے اس طرف اشارہ بھی کر دیا تھا کہ یہ ان پر بطور فرض عائد نہیں کیا جاسکتا،

یعنی بطور واجب و فرض تو اس کو زکوٰۃ اسی وقت قرار دیا جاسکتا تھا، جب کتاب یا سنت یا دونوں سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا،

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہو گیا کہ یہ ایک بالکل ہی نئی صورت تھی، جس میں صدقہ عائد کیا گیا اور اسی پر کیا اگر کسی ملک میں کوئی بالکل نیا حلال جانور تجارت اور افزائش نسل کے لئے پالا جانے لگے تو اس پر بھی زکوٰۃ لی جائے گی، لیکن چونکہ اس بارے میں کوئی اسوۂ نبوی یا ارشاد نبوی موجود نہیں تھا، اس لئے حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے احتیاطاً اس کو زکوٰۃ واجبہ[2] قرار نہیں دیا، بلکہ بطور صدقہ یا بطور ٹیکس کچھ رقم ان پر

۱؎ معانی الآثار ج ۱ ص ۱۱۳، ۲؎ زکوٰۃ واجبہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور نہ دینے والوں کے خلاف جنگ تک کی جاسکتی ہے، جیسا کہ مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا۔

عائد کی۔ اگرچہ ایسے گھوڑوں پر زکوٰۃ واجب بھی قرار دے دی جاتی تو یہ بھی کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے منشاء کے خلاف نہ ہوتا کیونکہ تجارتی اموال اور تمام سائمہ جانوروں پر زکوٰۃ کا وجوب کتاب و سنت سے ثابت ہے، آپ کے مذکورہ بالا ارشاد سے اشارۃً گھوڑوں پر زکوٰۃ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے انتہائی محتاط صورت اختیار فرمائی، پھر بھی یہ کہنا کتنی جرأت کی بات ہے کہ آپ نے سنت نبوی کے خلاف کوئی فیصلہ فرمایا۔

امہات الاولاد کی خرید و فروخت

وہ لونڈیاں جن کے بچے ہو جاتے ہیں، ان کو ام ولد کہتے ہیں، اس ام ولد کی جمع امہات الاولاد ہے، اس بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی میں ان کی خرید و فروخت کی اجازت تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ سے ان کی خرید و فروخت موقوف کر دی اور ان کو آزاد عورتوں کا مرتبہ دے دیا۔

اس سلسلہ میں اگر ان احکام ہی کو سامنے رکھا جائے جو کتاب و سنت میں غلاموں کی آزادی ان کی عزت افزائی اور معاشرہ میں ان کو آزاد انسانوں کے مساوی مرتبہ عطا کرنے کے سلسلہ میں دئے گئے ہیں تو بھی حضرت عمرؓ کا یہ طرز عمل کتاب و سنت کے منشا کے خلاف نظر آئے گا لیکن ان احکام کے علاوہ دوسرے قوی نقلی دلائل بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کوئی نیا فیصلہ نہیں کیا، بلکہ ایک حکم یا منشائے نبوی کو حکماً و قانوناً نافذ کر دیا، اسی نفاذ کی وجہ سے محدثین و مؤرخین اس کو ادلیات عمرؓ میں داخل کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ ہو،

غالباً ۷ھ میں مقوقس شاہ مصر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو کنیزیں بھیجی تھیں، جن میں ایک کا نام حضرت ماریہ قبطیہ تھا جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خدمت میں رکھ لیا، ان ہی کے بطن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے تھے، ان کی پیدائش کے بعد ایک بار صحابہ کے سامنے حضرت ماریہؓ کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا اب وہ لونڈی نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت ایک آزاد عورت کی ہے۔

اعتقها ولدها — ان کے بچے نے انھیں آزاد کر دیا۔

چنانچہ تمام ازواج مطہرات کی طرح وہ بھی پردہ ہی میں رہتی تھیں، اور ان کا نان نفقہ آپ ہی برداشت فرماتے تھے،

اس ارشاد نبوی سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اگر کسی لونڈی کو اس کے آقا کے صلب سے کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی حیثیت لونڈی اور کنیز کی نہیں، بلکہ ایک آزاد عورت کی ہو جاتی ہے، اب اس پر بھی وہ تمام احکام جاری ہوں گے، اور اس کو وہ تمام حقوق ملیں گے جو ایک آزاد عورت پر جاری ہوتے اور اس کو ملتے ہیں، ان ہی احکام اور حقوق میں ایک حکم اور حق یہ بھی ہے کہ جس طرح ایک آزاد عورت کو بیچا اور خریدا نہیں جا سکتا، اسی طرح اس کی بیع و شرا بھی نہیں کی جا سکتی،

آپ نے ایک دوسرے ارشاد میں فرمایا ہے کہ بچوں کو ان کی ماؤں سے جدا نہ کیا جائے ظاہر ہے کہ اگر ان کی خرید و فروخت ہو گی تو لامحالہ ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق ہو گی، کیونکہ خریدنے والا بھی ماں کے ساتھ بچے کی پرورش کا بار اٹھانے میں تامل کرے گا اور بیچنے والا بھی اپنی اولاد کو بیچنے پر مشکل سے راضی ہو گا، ایسی صورت میں دونوں میں تفریق لازم آئے گی،

اس سے بھی واضح آپ کا وہ ارشاد ہے جس میں آپ نے صراحۃً ام ولد کی آزادی کا اعلان فرمایا ہے، آپ نے فرمایا:

ایما امۃ ولدت من سیدھا فھی حرۃ اذا مات الا ان یعتقھا قبل موتہ[1]	جس لونڈی کو اس کے آقا کے صلب سے بچہ پیدا ہو جائے وہ اس کے مرنے کے بعد آزاد ہے، اگر وہ اپنی زندگی ہی میں اسے آزاد کر دے تو اسی وقت آزاد ہو جائے گی،

اس سے معلوم ہوا کہ آقا کی زندگی بھر وہ رہے گی تو اسی کے ساتھ کیونکہ جو تعلق اس سے قائم ہو چکا ہے اس کو موت سے پہلے منقطع کرنا تو مناسب نہیں ہے، لیکن بہر حال اب نہ تو وہ اس کی ملکیت سے نکل کر کسی دوسرے کی ملکیت میں جا سکتی ہے اور نہ آقا اس کو دوسرے کی ملکیت میں دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انتقال ملکیت ہی ممکن نہیں ہے، تو پھر اس کو فروخت کیسے کیا جا سکتا ہے،

ان ارشادات نبوی کو ذہن میں رکھ کر اب ایک نظر حضرت عمرؓ کے فیصلہ اور ان کے فرمودات پر

---

[1] اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے، ان کے علاوہ ابو یعلی اور امام احمد بن حنبل نے بھی اپنی اپنی مسندوں میں نقل کیا ہے، اس روایت میں بعض رواۃ کو ضعیف کہا گیا ہے، لیکن چونکہ یہ روایت ایک ہی طریقہ سے نہیں بلکہ متعدد طرق و واسطوں سے مروی ہے، اس لئے اس کا ضعف دور ہو جاتا ہے،

ڈال دیجئے،

آپ نے یہ حکم نافذ فرماتے ہوئے اعلان فرمایا کہ

ایما ولیدۃ ولدت من سیدھا فانہ لایبیعھا ولا یھبھا ولا یورثھا وھو یستمتع منھا فاذا مات فھی حرۃ

جس لونڈی کو بھی اس کے آقا کے صلب سے اولاد ہو جائے اس کو اس کا آقا نہ تو بیچ سکتا ہے اور نہ ہبہ کر سکتا ہے، اور نہ وراثت میں اس کو کوئی پا سکتا ہے، وہ اس سے زندگی میں متمتع ہوئے مرنے کے بعد وہ آزاد سمجھی جائے گی۔

گیا اوپر جو حدیث نبوی نقل کی گئی ہے، اس میں اور حضرت عمرؓ کے اس حکم میں ذرہ برابر بھی فرق ہے مشہور اور ممتاز تابعی حضرت سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ اسی بنا پر جب حضرت فاروقؓ نے ان کو آزاد کرنے کا حکم دیا تو یہ بھی واضح کر دیا کہ میں اپنے جی سے ایسا حکم نہیں دے رہا ہوں، بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں آزاد قرار دے دیا ہے، ابن مسیب کے الفاظ ملاحظہ ہوں،

ان عمر اعتق امھات الاولاد وقال اعتقھن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عمرؓ نے جب ان کی آزادی کا حکم دیا تو فرمایا کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آزاد کر دیا ہے،

یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں جمہور امت کا فیصلہ ہے کہ امہات الاولاد کی فروخت ممنوع ہے، آئمہ اربعہ جو جمہور امت کی نمائندگی کرتے ہیں وہ بھی اس مسئلہ میں متفق الرائے ہیں،

واتفقوا علی انہ لاتباع امھات الاولاد (افصاح ص ۴۴۴)

آئمہ اربعہ متفق ہیں کہ امہات الاولاد کو فروخت نہیں کیا جا سکتا،

شیخ ابن ہمام اپنی مشہور کتاب فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔

ھذا مذھب جمھور الصحابۃ والتابعین والفقھاء الامن لایعتد بہ کبشیر المریسی وبعض الظاھریۃ فقالوا یجوز بیعھا

یہ مسلک تمام جمہور صحابہ، تابعین اور فقہا کا ہے صرف چند ناقابل اعتنا آدمی ایسے ہیں جو اس کی فروخت کے قائل ہیں۔ مثلاً بشیر مریسی معتزلی اور بعض ظاہری،

امت کے چند افراد جو ام ولد کی فروخت کے قائل ہیں، ان کے استدلال کی بنیاد حضرت جابر بن عبداللہؓ

کا یہ بیان ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں امہات الاولاد کو فروخت کردیا کرتے تھے، مگر حضرت عمرؓ نے روک دیا تو ہم رک گئے۔" (ابوداؤد)

لیکن حضرت جابرؓ کے اس بیان سے یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہو یا آپ کو اس کا علم ہوا ہو، اور آپ نے منع نہ فرمایا ہو، یہ بات ضرور اہمیت رکھتی ہے کہ ایک صحابی عہد نبوی کا یہ تعامل بتا رہے ہیں، لیکن دو وجہوں سے اس بیان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی ایک یہ کہ اوپر آپ کے صریح ارشادات کے مقابلہ میں اس ایک بیان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، دوسرے یہ کہ کسی صحابی کے بیان کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت اس وقت ہوتی ہے جب اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر بھی ہو یعنی اس واقعہ کا آپ کو علم ہوا ہو۔ اور آپ نے اسے پسند یا ناپسند فرمایا ہو یا اس پر خاموش رہے ہوں، جب تک آپ کی تقریر نہ ہو اس وقت تک اس کا قوی امکان ہے کہ آپ کو اس واقعہ کا علم ہی نہ ہوا ہو، اور جب تک آپ کو علم نہ ہوا ہو، اس کی شرعی یا غیر شرعی کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا، اور اس کا امکان اس لئے بھی زیادہ ہے کہ امہات الاولاد کی خرید و فروخت کا موقع شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا، یہ عام خرید و فروخت کی طرح روزمرہ کی چیز نہیں تھی کہ اس کا علم لامحالہ آپ کو ہو ہی جاتا، اور یہ بات اس لئے اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ لونڈیوں کی اتنی کثرت عہد نبوی میں تھی بھی نہیں جتنی کہ روم و ایران کے فتح ہونے کے بعد ہوئی، امام خطابی معالم السنن میں جابر بن عبداللہ کے بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

یحتمل ان یکون هذا الفعل منهم فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو لا یشعر بذالك لانه امر یقع نادراً ولیست امهات الاولاد کسائر الرقیق	اس بات کا قوی احتمال ہے کہ عہد نبوی میں صحابہ نے ایسا کیا ہو۔ اور آپ کو اس کا علم نہ ہوا ہو اس لئے کہ ام ولد کی خرید و فروخت کا معاملہ شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا، اور اس لئے بھی کہ امہات الاولاد کا عام غلاموں کی طرح نہیں تھیں۔

اس مسئلہ کے ہر پہلو کو ناظرین کے سامنے رکھ دیا گیا ہے اب وہ خود ہی فیصلہ کریں کہ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کو خلاف سنت کہنا کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا کہنا اس مسئلہ سے انتہائی ناواقفیت کی دلیل نہیں ہے؟

بیس رکعت باجماعت تراویح اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں آٹھ رکعتیں تراویح پڑھی جاتی تھیں، مگر حضرت عمرؓ نے اسے بیس رکعت کر دیا، اس موضوع پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن سلسلۂ اولیاتِ عمرؓ کی ایک کڑی یہ بھی ہے، اس لئے مختصراً چند باتیں عرض کر دی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ مسئلہ نہ تو کسی چیز کی تحریم و تحلیل کا ہے اور نہ اس کا تعلق فرائض شرعی سے ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ سنت مؤکدہ ہے، اس لئے ان کو ان مسائل پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، جن کا تعلق حرام و حلال یا فرائض سے ہے۔

دوسری بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ جتنی اور نفل اور سنت نمازیں آپ نے پڑھی ہیں، ان میں آپ کا معمول یکساں نہیں رہا ہے، اور ایسا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ فرض و واجب نمازوں اور مؤکدہ اور غیر مؤکدہ سنتوں میں فرق ہو جائے، مثال کے طور پر نماز تہجد کو لے لیجئے نماز تہجد آپ نے ہمیشہ مزاولت اور مداومت سے پڑھی، مگر اس کی رکعتوں میں ہمیشہ آپ کمی بیشی فرمایا کرتے تھے،

اسی طرح نماز تراویح یعنی رمضان میں نوافل پڑھنے کے سلسلہ میں بھی آپ کا طرز عمل یکساں نہیں تھا، کثرت سے حدیثوں میں یہ ذکر ہے کہ آپ دوسرے زمانہ میں عبادت کرنے میں جتنی محنت و مشقت اٹھاتے تھے، اس سے بہت زیادہ رمضان میں فرماتے تھے، آپ کے ساتھ تمام صحابہ کا معمول بھی یہی تھا کہ جس سے جس قدر ہو سکتا تھا، وہ نفل پڑھتا تھا، دوسرے زمانہ میں آپ یا صحابۂ کرام جو نفلیں پڑھتے تھے، وہ عموماً انفرادی طور پر اپنے اپنے گھروں میں پڑھتے تھے، مگر رمضان میں صحابہ میں بعض لوگ مسجد میں بھی آکر انفرادی طور پر بھی نفل پڑھتے تھے، اور بعض لوگ باجماعت بھی، گو یہ جماعت فرض نمازوں کی طرح نہیں ہوتی تھی، بلکہ دو دو چار چار آدمی مل کر پڑھ لیتے تھے، یعنی بیک وقت کئی کئی جماعتیں ہوتی تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیفیت دیکھی تو ایک سال خود بنفس نفیس مسجد میں تشریف لائے اور تین یا چار دن تک صحابہ کے ساتھ جماعت نماز تراویح ادا فرمائی، تیسرے دن اس نماز میں صحابہ کا اتنا ہجوم ہوا کہ مسجد نبوی میں جگہ نہیں تھی، آپ نے جب صحابہ کے ذوق و شوق کی یہ کیفیت دیکھی تو آپ نے مسجد میں آنا موقوف فرما دیا، صحابہ نے جب وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہ یہ ذوق و شوق دیکھ کر اللہ تعالیٰ اسے تمہارے اوپر فرض نہ کر دے

اور تم اس ذوق و شوق کو باقی نہ رکھ سکو اور ایک فرض کے تارک بن کر گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لاد لو۔"

بعض روایات میں ہے کہ پہلی رات کو آپ نے ایک پہر تک دوسری رات کو دو پہر تک اور تیسری یا چوتھی رات کو اتنی دیر تک نماز تراویح پڑھی کہ صحابہ کو یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں سحری نہ چلی جائے۔

غرض یہ کہ آپ سے جتنی روایات مروی ہیں ان سب میں چند باتیں مشترک ہیں، رمضان میں کثرت سے نوافل پڑھنا، صحابہ کا متفرق جماعتوں میں تراویح پڑھنا، تین یا چار دن تک مسجد میں آپ کا خود اکر جماعت نماز تراویح پڑھنا، زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھنا، اب روایتوں میں جو کچھ اختلاف ہے وہ تعداد رکعات کی تعیین میں ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ فرض نمازوں اور فرض کے ساتھ جو سنتیں پڑھی جاتی ہیں، ان کے علاوہ دوسری تمام نفل نمازوں میں آپ کا طرز عمل مختلف ہوتا تھا، ان میں نہ تو آپ خود کوئی مقرر تعداد ادا فرماتے تھے، اور نہ صحابہ کو اس کا حکم فرماتے تھے، چنانچہ یہی بات[1] تراویح میں تھی، آپ نے کسی دن بھی پہلے سے کچھ رکعتیں متعین کر کے تعلیم نہیں پڑھیں، نہ تو اپنی انفرادی تراویح میں اور نہ اس تراویح میں جو آپ نے تین دن تک مسجد میں ادا فرمائی، اسی بنا پر صحابہ سے تعداد رکعات کے سلسلہ میں مختلف روایتیں[2] مروی ہیں کسی میں ۸ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے، کسی میں ۱۸ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے کسی میں بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے، اور کسی میں ۳۶ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے، کسی میں ۳۸ رکعت کا ذکر ہے اور تین رکعت وتر کا، غرض یہ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں جن صاحب نے جو

---

[1] قیام رمضان یا تراویح میں آپ کا عام معمول ——— از روئے احادیث صحیحہ ——— گیارہ رکعت (مع وتر) ہی رہا، صحیح بخاری باب فضل من قام رمضان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مذکور ہے ما کان یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ اما محمد بن نصر المروزی رح کی کتاب قیام رمضان اور معجم صغیر طبرانی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان لیلۃ ثمان رکعات والوتر فلما کان من القابلۃ اجتمعنا فی المسجد ورجونا ان یخرج الینا فلم نزل فیہ حتی اصبحنا قال انی کرھت وخشیت ان یکتب علیکم الوتر (قیام اللیل ص ۹ طبع لاہور)

قال الحافظ الذھبی فی المیزان فی ترجمۃ عیسیٰ بن جاریۃ اسنادہ وسط، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ گیارہ سے زائد نفل نہ پڑھے جائیں و اما ما روی ابن ابی شیبۃ عن ابن عباس انہ (باقی حاشیہ بر صفحہ ۲۲۴)

تعداد زیادہ صحیح سمجھی، یا انہوں نے جتنی رکعتیں پڑھتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اتنی بیان کر دی، یا جس میں انہوں نے امت کے لئے سہولت دیکھی اس کے مطابق فتویٰ دیا اور ان میں سے کوئی فتویٰ سنت نبوی کے خلاف نہیں تھا، حضرت عمرؓ نے جس طرح بے شمار امور میں نظم وضبط سے قائم کیا، اس طرح تراویح میں بھی ایک نظم قائم کیا، یعنی انہوں نے یہ حکم دیا کہ لوگ ایک امام کے پیچھے باقاعدہ جماعت سے نماز تراویح پڑھیں، تعداد رکعت میں آپ نے ۸، ۳۸ کے درمیان بیچ کی سنت کو اختیار فرمایا، یعنی بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر،

اوپر سنت نبوی کی جو تفصیل کی گئی ہے، اس کی روشنی میں اب حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کو ملاحظہ کیجئے، اس میں کون سی چیز ایسی ہے جو ان کی ایجاد کہی جا سکتی ہے؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے پورے مہینے میں نفل نمازیں نہیں پڑھتے تھے؟ کیا آپ کے علم میں صحابہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں مسجد میں نماز تراویح نہیں پڑھتے تھے؟ کیا خود آپ نے تین دن صحابہ کے ساتھ باجماعت نماز تراویح ادا نہیں فرمائی؟ کیا آپ اور صحابہ اس نماز میں زیادہ سے زیادہ قرآن نہیں پڑھتے تھے؟ کیا آپ اور صحابہ انتہائی ذوق وشوق سے یہ نماز ادا نہیں فرماتے تھے؟ کیا آپ کے ارشاد سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اگر آپ کو فرض

(بقیہ ص ۲۲۳) علیہ الصلوٰۃ والسلام کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ فضعیف بابی شیبۃ ابراھیم بن عثمان متفق علی علی ضعفہ مع مخالفۃ للصحیح قال لہ ابن الہمام کذا فی مرقاۃ القاری

(ص ۱۷۵ ج ۲) (رحیق)

سے یہ روایتیں امام مروزی رح کی متذکرہ کتاب میں سب آگئی ہیں۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ مرفوع طور پر صرف آٹھ ہی ثبوت کو پہنچی ہیں، اس سے زیادہ تعداد کی روایات یا صحابہؓ سے افعال ہیں یا تابعینؒ کے جو قیام رمضان کی ترغیب میں وارد احادیث مرفوعہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے درست ہیں، وہ نص نبوی میں تغیر نہیں، بلکہ اس پر عمل ہی کی ایک صورت ہے، (رحیق)

حاشیہ ص ہذا سلہ موطا امام مالکؒ میں قوی سند سے مروی ہے، کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ اور تمیم داری رضؓ کو ۱۱ رکعت تراویح پڑھنے کا ہی حکم دیا تھا، عن السائب بن یزید انہ قال امر عمر بن الخطاب ابی بن کعب تمیما الداری ان یقوما للناس باحدی عشرۃ رکعۃ،

ہاں سند منقطع کے ساتھ موطا شریف میں یہ بھی موجود ہے، کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیس رکعت (باقی بر صفحہ ۲۲۵)

ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو آپ باجماعت نماز تراویح کو برابر جاری رکھتے۔

غرض یہ کہ جس حیثیت سے بھی دیکھا جائے، حضرت عمرؓ کا طرز عمل بالکل سنت نبوی اور منشائے رسول کے مطابق معلوم ہوتا ہے، آپ نے جو کچھ کیا، وہ یہ کہ اس کو مہینہ بھر باقاعدہ جماعت کے ساتھ ضروری قرار دیا، اور یہ بھی حکم دیا کہ پورا قرآن اس میں ختم کیا جائے، یہ دونوں باتیں بھی منشائے نبویؐ کے خلاف نہیں ہیں، مہینہ بھر آپ سے رمضان میں نفل پڑھنا بھی ثابت ہے اور قرآن کا پڑھنا بھی، آپ رمضان میں صرف نفل نمازوں ہی میں قرآن نہیں پڑھتے تھے، بلکہ اس خیال سے کہ قرآن کا کوئی لفظ حافظہ سے محو نہ ہو گیا ہو، ہر سال حضرت جبریلؑ سے پورے قرآن کا دورہ بھی فرما لیا کرتے تھے، حدیث میں ہے کہ آپ ہر سال رمضان میں ایک بار حضرت جبریلؑ سے قرآن کو دہرا لیا کرتے تھے، لیکن جس سال آپ کا وصال ہوا آپ نے اس سال دو باران سے دور فرمایا، تاکہ قرآن کا ایک ایک لفظ امت کو بے کم و کاست آپ سکھا اور پڑھا جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت تراویح کو پسند فرمایا تھا، مگر جماعت اس لئے ترک فرما دی تھی کہ یہ فرض نہ ہو جائے، آپ کی وفات کے بعد وحی کا سلسلہ چونکہ منقطع ہو گیا تھا، اور اب اس کے فرض ہو جانے کا خطرہ باقی نہیں تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے آپ کے منشاء کی تکمیل کر دی، جب آپ سے پورے مہینہ نفل میں قرآن پڑھنا بھی ثابت ہے، اور اس کا یاد کرنا اور دور کرنا بھی، تو ان دونوں باتوں کے پیش نظر اگر حضرت عمرؓ نے پورے مہینہ میں قرآن سننے اور سنانے کا حکم دیا تو اس میں نئی بات کون سی تھی جس طرح آپ نے قرآن کے دور کے لئے اس مبارک مہینہ کو اختیار فرمایا تھا، اسی طرح حضرت عمرؓ نے اس کو یاد رکھنے کی یہ صورت اختیار فرمائی کہ اس کو تراویح میں سنایا جائے، تاکہ سنانے والا پوری توجہ سے سنا سکے اور سننے والے پوری توجہ سے سن سکیں، کیونکہ نماز میں اس کا موقع زیادہ ہوتا ہے، اس طرح دونوں کو قرآن کے یاد کرنے میں مدد ملے گی، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر تراویح میں پورے قرآن سننے کا رواج ختم ہو جائے تو مشکل سے دو چار حافظ ملیں گے،

آپ نے اسے نعم البدعۃ یعنی ایک نئی اچھی بات اس لئے کہی کہ عہد نبوی کے بعد باجماعت تراویح کا اہتمام سب سے پہلے آپ ہی نے فرمایا تھا، اور اس لئے بھی یہ نئی بات تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تراویح کے علاوہ پورے قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے، اور حضرت عمرؓ نے اس کو تراویح میں پڑھنے کا حکم فرمایا، گویا آپ کے

([illegible])

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴ (علاوہ وتر) بھی لوگ پڑھتے تھے، عن ابن رومان انہ قال کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعۃ۔ (رحیق)